CARE LIST APPROVED PEER REVIEWED & REFEREED JOURNAL ISSN 2320-3781

نقشِ نو

۲۰۲۳ء۔۲۰۲۴ء

سالانہ عالمی اردو جریدہ

(سرسید نمبر)

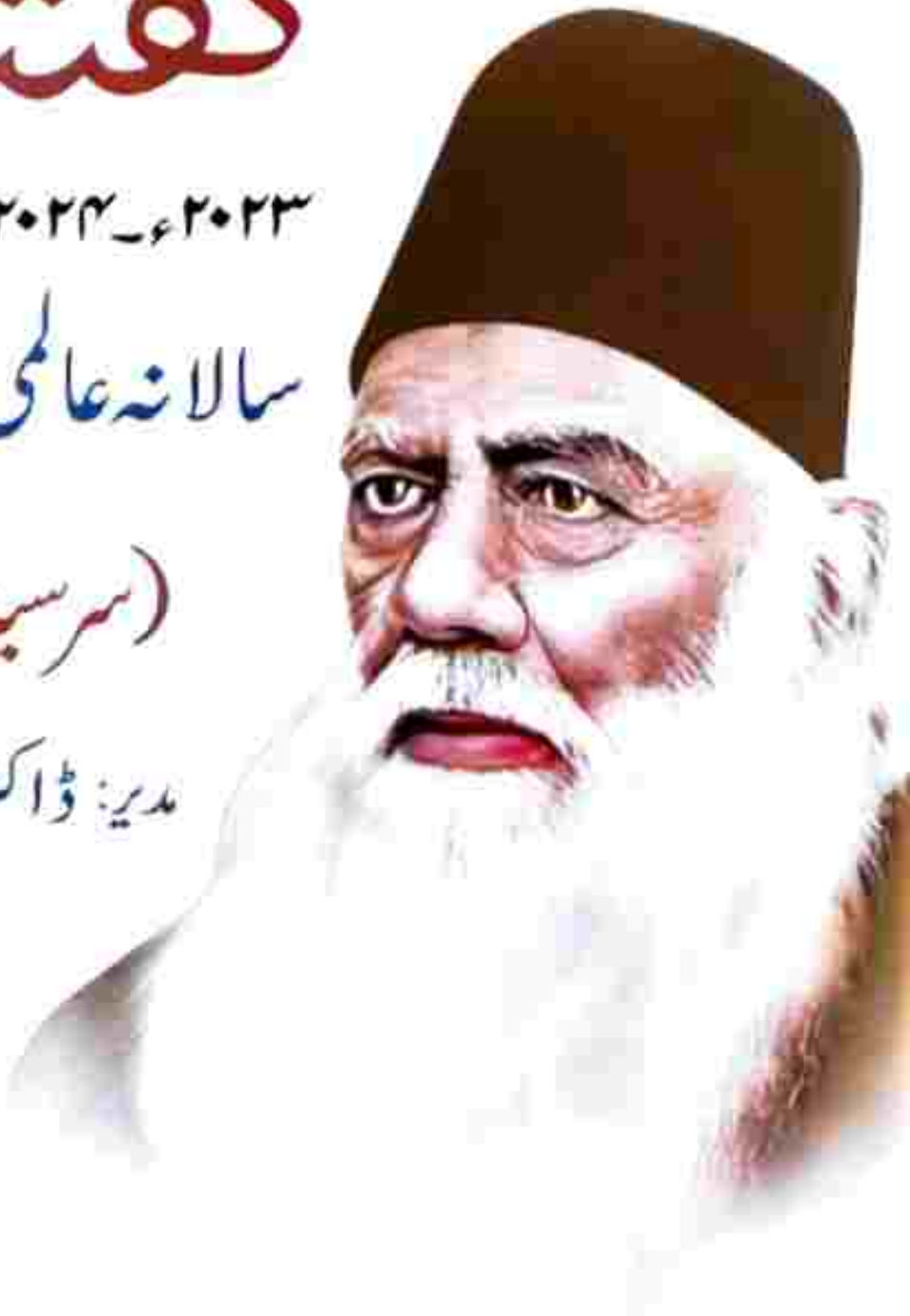

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگراج

الہ آباد یونیورسٹی

نقشِ نو

(سرسید نمبر)

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شمارہ: شش و ہم

۲۰۲۳ء۔۲۰۲۴ء

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

نائب مدیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

الہ آباد یونیورسٹی، یو۔پی۔انڈیا

'نقشِ نو' سالانہ عالمی اردو جریدہ۔شمارہ شش دہم

یو۔جی۔سی۔CARE لسٹ میں منظور شدہ جریدہ

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ

اعزازی مدیر: پروفیسر عبدالحق

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

نائب مدیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم

مجلسِ مشاورت:

ڈاکٹر مامون ایمن (نیویارک)

پروفیسر شبنم حمید (پریاگ راج)

ڈاکٹر عارف نقوی (جرمنی)

ڈاکٹر ندرت محمود (پریاگ راج)

ڈاکٹر محمد آصف علی (ماریشس)

ڈاکٹر شبانہ عزیز (پریاگ راج)

پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)

ڈاکٹر صدیقہ جابر (پریاگ راج)

پروفیسر احمد محفوظ (دہلی)

ڈاکٹر فرح ہاشم (پریاگ راج)

پروفیسر یوسف نفیس (پریاگ راج)

کمپیوٹر کمپوزنگ: روزینہ انصاری

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، پریاگ راج۔یو۔پی۔انڈیا

فون نمبر: 0532-2978600 موبائل نمبر: 7007400501- 9559258741

ای میل: naqshenauurdu@gmail.com

ISSN 2320-3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 200 روپے، بیرونِ ملک 20 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	حرفے چند	پروفیسر ناصحہ عثمانی	
۲۔	''سرسید مشن'' وقت کی اہم ضرورت	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۷
۳۔	سرسید اور الہ آباد کے تعلیمی رشتے	پروفیسر صالحہ رشید	۱۶
۴۔	سرسید اور اسباب بغاوت ہند	ڈاکٹر زرینہ بیگم	۴۳
۵۔	سرسید احمد خاں	ڈاکٹر شبانہ عزیز	۵۵
۶۔	سرسید احمد خان کی خطوط نگاری	ڈاکٹر ناظم الدین منور	۶۸
۷۔	سرسید احمد خاں کے تعلیمی افکار و خیالات	ڈاکٹر داؤد احمد	۹۸
۸۔	سرسید احمد خان کا تصور تربیت اطفال	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۱۰۷
۹۔	سرسید کا نظریہ ''تعلیم نسواں''	ڈاکٹر شیخ عمران	۱۱۹
۱۰۔	سرسید احمد خان: اردو میں جدید تاریخ نویسی کے بانی	ڈاکٹر نزہت فاطمہ	۱۲۸
۱۱۔	سرسید کی نثر نگاری	ڈاکٹر عبدالواسع ندوی	۱۳۹
۱۲۔	مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' تاثراتی جائزہ	ڈاکٹر عارفہ بیگم	۱۴۶
۱۳۔	سرسید اور اردو صحافت	ڈاکٹر ناہیدہ خاتون	۱۵۰
۱۴۔	علی گڑھ تحریک سے متاثر افسانوں میں مستورات کی عکاسی	ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری، عافیہ حمید	۱۵۸
۱۵۔	ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی بہتری اور ترقی میں سرسید احمد خان کا تعاون	ڈاکٹر تبسم نگار	۱۶۹
۱۶۔	متحدہ قومیت کا تصور اور سرسید احمد خاں	رخسار پروین	۱۸۳

علی گڑھ تحریک سے متاثر افسانوں میں مستورات کی عکاسی

عورتوں کے انسانی مساوات اور سماجی حقوق کی بات کی جائے تو تواریخ کے صفحات کے صفحات سیاہ نظر آتے ہیں۔ تمام ترقی یافتہ مذاہب و ممالک خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور عورتوں کے حقوق و مرتبہ پر چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے فلسفی نسوانی کرداروں کے حقوق اور ان کی سماجی حقوق طے کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ ارسطو و افلاطون بھی صحیح معنوں میں عورت کی حیثیت متعین نہ کر سکے۔ طلوع اسلام سے قبل عورتوں کی سماجی حیثیت بہت زیادہ خراب تھی۔ ان کا یقین تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو اپنی لڑکی دے کر ہمیشہ کے لئے اس سے کم تر ہو جائے گا۔ اس لئے وہ پیدائش کے وقت ہی لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے یا پیدا ہونے کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دیتے تھے۔ قدیم ہندوستان میں عورتوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ عورت دھیرے دھیرے سماجی زندگی میں اپنا وقار کھو رہی تھی اور وہ مرد کی خواہشات پوری کرنے کا صرف ایک آلہ ہو کر رہ گئی تھی، جس کے حوالے ویدوں، اپنشدوں اور اس سے پہلے کے ادب میں ملتے ہیں۔ عورتوں کے ذہن پر مذہب کے ایسے گہرے پردے ڈال دیئے گئے تھے جن سے باہر دیکھنا ان کیلئے ممکن ہی نہیں تھا۔ مذہبی باتیں اور مثالیں عورت کے ذہن پر ایسا نفسیاتی اثر ڈالتی تھیں کہ وہ تمام عمر اپنی مسرت اور خوشیوں کا انحصار انھیں پابندیوں میں جکڑی ہوئی پاتی تھیں۔ ان کے سامنے ستی ساوتری اور بعض دوسری مثالی عورتوں کی زندگی کے نمونے اس طرح سے پیش کیے جاتے تھے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد شوہر کے ہر جائز اور ناجائز حکم کی پابندی سمجھنے لگتی تھیں اور اسی میں ابدی مسرت محسوس کرتی تھیں۔ مگر وقت اور حالات نے کروٹ بدلے اور ایک نئے دور کا سورج طلوع ہونے لگا۔ عورتوں کے لبوں پر لگے قفل ٹوٹنے لگے اور گھر کی چہار دیواری کی قید سے عورتوں نے آزادی کے نغمے گانا شروع کر دیئے۔ ان کی آنکھیں چہار دیواری سے باہر کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے بے

ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری، اسسٹنٹ پروفسر، عافیہ حمید (ریسرچ اسکالر)، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ

قرار دکھائی دینے لگیں۔ اسی وقت سماج کا دانشور طبقہ بھی اس نئی سوچ کا حامی اور حقوق نسواں کے فروغ کے لئے کوشاں نظر آنے لگا۔ صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی نے بھی بڑی حد تک آزادی نسواں کے لئے راہ ہموار کی۔

اس طرح انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اسی زمانے میں سرسید نے مسلمانوں کو سماجی، سیاسی پستی سے نکالنے کے لئے اسکول کھولے، انجمنیں قائم کیں اور اخبار نکالے۔ انہوں نے 1870 تہذیب الاخلاق کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے کا کام لیا تا کہ وہ ملک وقوم کی ترقی میں برابر کے حصہ دار بن سکیں۔ علاوہ ازیں 1886 میں مسلم ایجوکشنل کانفرنس کی بنا ڈالی تا کہ اہل وطن کے اندر علم کی روشنی پھیلائی جا سکے۔ سرسید کی انہیں کاوشوں اور کوششوں کو اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو سماجی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا۔ تعلیم کی کمی اور کسی فکری نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ پستی کی آخری منزلوں تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مردوں کی تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ کی لیکن جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ہمیں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کو مذہبی اور سماجی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور خواتین کے پردے پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ اس سلسلے میں شیخ عبداللہ کی خودنوشت ''مشاہدات وتاثرات'' کے مطالعہ سے اس بات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

علی گڑھ تحریک سے منسلک ادباء وشعراء نے حقوق نسواں اور ان کے مساویانہ سلوک پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس، بنات النعش اور رویائے صادقہ اور الطاف حسین حالی نے مجالس النساء جیسے ناول، مناجات بیوہ اور چپ کی داد جیسی نظمیں لکھ کر عورتوں کی سماجی، مذہبی واخلاقی صورت حال سے اردو کے قارئین کو متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ 1904 میں شیخ عبداللہ کی کوششوں سے علی گڑھ میں عورتوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حقوق نسواں اور تعلیم نسواں

کے سلسلے میں کئی اہم فیصلے لئے گئے۔ اس کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں فرماں روائے بھوپال سلطان جہاں بیگم نے اس کے انتظام وانصرام میں بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔ اسی دوران شیخ عبداللہ نے ''فیمیل ایجوکشن ایسوسی ایشن'' نامی تنظیم کی بنا ڈالی اور محلہ ''بالائے قلعہ'' میں گرلس اسکول قائم کیا جو آج' ویمن کالج' کے نام سے مشہور ومقبول ہے۔ اس طرح شیخ عبداللہ اور دیگر دانشوروں کی کوششوں سے عورتوں کو مساویانہ حقوق حاصل ہوئے اور ان کے لئے علم کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھل گئے۔ ان کی عملی کوششوں نے اردو کے بیدار ذہنوں کو متاثر کیا، جس کے سبب اردو کے متعدد ادیبوں اور شاعروں نے مستورات کے مسائل ومصائب کو اپنی نگارشات میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے اثرات مختلف اصناف کے ساتھ افسانوں پر بھی بالواسطہ پڑے ہیں۔ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوکر جو ناول یا افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اصلاح نسواں کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ اس تحریک سے منسلک قلم کاروں کا ایک مقصد سماج میں عورتوں کے حقوق کی بازیابی تھا تو دوسرا سماج میں عورتوں کے اندر موجود برائیوں کو دور کر کے ان کی اصلاح وتربیت کا سامان بھی فراہم کرنا تھا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس، بنات النعش، رویائے صادقہ اور الطاف حسین حالی نے مجالس النساء جیسے ناول تخلیق کئے۔ نیز اس مقصد کے پیش نظر متعدد افسانہ نگاروں نے قلم کو جنبش دی۔ مثلاً محمد مجیب کا ''کیمیا گر'' محمد احسان اللہ العباسی کا ''زاہدہ''، ''فسانہ دل پذیر'' اور ''المجاہد''۔ علامہ راشد الخیری کا ''بدنصیب کا لال''، ''رویائے مقصود''، ''شناس ودراج''، ''نند کا خط بھاوج کے نام''، ''سوکن کا جلاپا''، ''کثرت ازدواج''، ''بے زبانوں کا صبر''، ''ماہ حسن اندرا'' سلطان حیدر جوش کا ''نابینا بیوی''، قاضی عبدالغفار کا ''تیس پیسے کی چھوکری۔ علی محمود کا ''ایک پرانی دیوار''، ''چھاؤں''۔ مرگ محبوب ''وزارت علی اور بنی''، دردمند اکبر آبادی کا ''تصویر غم''، خواجہ حسن نظامی کا ''بیگمات کے آنسو''، ''شہزادی کا بڑھاپا'' حامداللہ افسر

کا "سوتیلی ماں"، "دوسری شادی" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

افسانہ نگار محمد مجیب کے افسانہ "کیمیا گر" میں نسوانی کردار کو نہایت مضبوط، باوفا اور ہمدرد دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں "حکیم مسیح" (افسانے کا مرکزی کردار) کی بیوی ہر حال میں اپنے شریک حیات کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی رہتی ہے اور ان کے ساتھ سماجی خدمات کو بخوبی انجام دیتی ہے۔ خاص کر افسانوں کے ذریعہ افسانہ نگار نے عورت کو مرکزی کردار کے طور پر عوام و خواص کے سامنے پیش کیا ہے اور نسوانی کرداروں کو سماج و معاشرے میں ایک اہم مقام و مرتبہ دلانے کے لئے آواز بلند کی ہے۔ نیز نسوانی جذبات و احساسات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں :

'ادھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر "یارسول" کا ایک نعرہ سنا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لیے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں۔ دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔ مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی، اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔ وہاں ابھی لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:

''لالہ سیتارام کی بیوی بیمار ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لئے کوئی نہیں۔ اگر وہاں چلی جائیں۔۔۔''

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام ونشان نہ تھا آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرے سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتارام کے گھر پہنچ گئیں۔۔۔''

(اردو افسانے کی روایت، مرزا حامد بیگ، ص ۹۳۴)

علامہ راشد الخیری کے افسانوں کا محور ومرکز مشرقی روایات اور تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ طبقہ نسواں کی خدمات رہا ہے۔ ان کی یہ شعوری کوشش خواتین کو ذلت اور رسوائی کے غار سے نکالنے کی تھی جس کے لئے انہوں نے 1909 میں ماہنامہ ''عصمت'' اور اپریل 1911 میں رسالہ ''تمدن'' نکالا۔ 1915 میں ایک ہفتہ وار پرچہ ''سہیلی'' کے نام سے بھی شروع کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ''بنات'' اور ''جوہر نسواں'' کے نام سے بھی رسالے نکالے جو حقوقِ نسواں اور ان کی آزادی کے حامی وحمایتی تھے۔ ان کی اشاعت کا مقصد خواتین میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کرنا، انہیں سلیقہ مند اور باحوصلہ بنانا تھا، تاکہ وہ نت نئے مسائل کا بہادری سے مقابلہ کرسکیں۔ ان کے افسانوں کا باریک بینی مطالعہ وشاہدہ کیا جائے تو یہ بھرپور تاثر ابھرتا ہے کہ وہ خواتین کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی ہر ممکن کوشش کررہے تھے۔ راشد الخیری نہ صرف محسنِ نسواں تھے بلکہ مسائل کو فنی ضابطے کے ساتھ افسانوں میں پیش کرنے کی صلاحیت سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے افسانوں کا بنیادی مقصد سماجی اصلاح کے ساتھ ہی ساتھ حقوق نسواں کی اصلاح بھی تھا۔ ان کے بارے میں اردو کے مشہور ومعروف فکشن نگار امتیاز علی تاج نے ان کے مقصد حیات کو اس طرح سے بیان کیا ہے جو حقوق نسواں کی جدوجہد اور ان کی آزادی میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ سید امتیاز علی تاج رقم طراز ہیں:

''مولانا راشد الخیری عورتوں کے حقوق کے پُرزور حامی تھے چنانچہ وہ زندگی بھر عورتوں پر مردوں کے مظالم سے نجات دلانے کی کوشش کرتے رہے۔ عقدِ بیوگان، حقوقِ نسواں ان کے خاص موضوع تھے جن کا ذکر ان کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ انہوں نے مزاحیہ افسانے بھی لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت حزن و ملال کی تصویر کشی کے لئے موزوں تھی۔''

(مولانا راشد الخیری کا انتقال، سید امتیاز علی تاج (تہذیب نسواں، ۱۵ فروری ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۶)

راشد الخیری کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' ماہنامہ مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۳ میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ خطوط کی تکنیک میں تخلیق کیا گیا ہے جس میں بڑی بہن نے اپنے چھوٹے بھائی کو خطوط کے ذریعہ نصیحتیں کی ہیں اور مرحوم بہن کے بچوں کی خراب حالت کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پرورش کا معقول بندوبست کرنے کی درخواست کی ہے۔ اردو فکشن میں غالباً سب سے پہلے اس تکنیک کا استعمال علامہ راشد الخیری نے ہی کیا ہے۔ اس افسانے کے پندرہ سال بعد ۱۹۱۸ء میں راشد الخیری کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گوہرِ مقصود'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں تین طویل افسانوں کا ایک مختصر مجموعہ ''جوہرِ عصمت'' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں اسی نام سے دس اور افسانوں کے ساتھ یہ مجموعہ ۱۹۲۷ء میں چھپا۔ ''مظلوم بیوی کا پاک جذبہ''، ''بھنور کی دلہن''، ''بے گناہ کا قتل''، ''عدل جہانگیری'' اور ''بلبل کی شہادت'' اس مجموعے کے اہم افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں عورتوں کی مظلومی اور ان کے صبر و استقلال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ راشد الخیری نے اپنے افسانوں کے ذریعہ مسلم خواتین کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستان کو اجاگر کیا ہے اور تعلیم و تربیت کی ترغیب دی ہے۔ اصلاحِ معاشرت کے جتن کئے۔ اصول خانہ داری اور حفظانِ صحت کی تعلیم دی۔ بچوں کو نگہداشت کا قرینہ بتایا۔ جہیز کے سلسلے میں رسموں کی قباحت، تعددِ ازدواج، طلاق اور وقف علی الاولاد جیسے مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے افسانہ ''جہانگیری عدل'' (مجموعہ جوہرِ عصمت) میں ایک پاک باز خاتون کے کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنی عصمت کے تحفظ کے لئے زر و جواہر کو ٹھکرا دیتی ہے اور ان کے عوض پریشانیوں کو قبول کر لیتی

ہے۔ راشد الخیری کا یہ افسانہ ''نسیمہ کی سنگ دلی'' میں جہاں ایک طرف ایک عورت کی وفاداری اور صبر کی مثال نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف ایک محبت کرنے والی ماں کی تصویر بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کے افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''دوپہر ہو چکی تھی۔ گود میں لے کر لیٹی تو بچہ سو گیا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو نماز کو اٹھی۔ فارغ ہو کر بچے کے پاس آئی تو اس کا پنڈا پھکیا تھا۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ بچے کو تو اس غضب کا بخار چڑھا کہ ابھی تو یہ عشاء کے وقت تک وہ معصوم چنوں کی طرح بھن رہا تھا۔ اتنا بڑا اجھنڈار گھر ما چلی گئی اور نسیمہ اپنے لال کو گود میں لئے پڑی رہی۔ دن کی باتیں یاد آ گئیں۔ کلیجے پر تیر برسے۔ لحہ لحہ بعد دیکھتی تھی کہ شاید بدن پسیج گیا ہو مگر وہاں تو بھاڑ بھن رہا تھا۔ نسیم آج کسی خاص جلسے میں تھا۔ معصوم بچہ ظالم باپ کو بخار کی حالت میں خواب دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً آنکھ کھولی۔ ابا کہہ کر ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے ہر چند چمکارا مگر وہ روتا پیٹتا گود سے اترا اور دیوان خانے کے دروازے پر گیا اور باپ کو بلاتا رہا۔ لاکھ نسیمہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا ابھی نہیں آئے، مگر وہ بلک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اماں جان! اندر لیٹے ہیں، کنڈی لگائی ہے۔ اب نسیمہ بچے کو گود میں اٹھا کر اندر کے دالان میں آئی۔ منہ پر منہ رکھا۔ پیار کیا۔ چمٹایا، گلے میں ہاتھ ڈالے ننھے ننھے ہاتھوں کو سینے پر رکھا اور رو کر کہا۔ ''معبود حقیقی! یہ دکھیا مصیبت زدہ نسیمہ کا لال تری امانت ہے الہ العالمین! مجھ بدنصیب پر رحم کیجیو۔ سچے آقا! اچھے معبود! دکھیاری کا لال شکستہ دل کا چراغ ہے۔'' نسیمہ یہیں تک پہنچی تھی کہ نسیم پھر اٹھا اور کہنے لگا۔ اچھی ماں جان! چھوڑ دو دیکھو ابا جان گملوں کے پاس کھڑے ہیں۔

نسیمہ کے پاس اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔ کبھی اس کو سینے سے لگاتی اور کبھی اس کی ضد پر چھوڑ دیتی۔ تین بج چکے تھے۔ چار برس کا پلا پلایا بچہ آج ماں کے ہاتھوں میں تھا۔ بارش زور وشور سے ہو رہی تھی اور اس عظیم الشان مکان میں ایک بدنصیب ماں اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو لئے بیٹھی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرتی پاؤں کو پیار کرتی۔ بلبلاتی اور روتی۔ بچے

نے پانی مانگا رات کا وقت تھا۔ گود میں لے کر دروازے پر آئی کہ کسی سے شربت منگوا کر معصوم کا حلق تر کردوں۔
مگر سڑک پر سناٹا تھا۔ الٹی لوٹی اور یہ کہہ کر پانی پلا دیا۔ ''کلیجے کے ٹکڑے! شربت بھی نصیب نہ ہوا۔''
نسیمہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ نسیم کو پھر غفلت ہوئی اور ماں کا منہ اس کے ہونٹوں پر تھا کہ وہ چونکا اور کہا اچھی
اماں! وہ آ گئے۔ ابا آؤ۔ ابا۔
بیچاری نسیمہ نے اس وقت بہلانا چاہا مگر بچہ نہ سنبھلا۔ کھڑا ہوا، مگر گرا۔ گرتے ہی ماں نے گود میں لیا، لیتے
ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ''ابا'' زبان سے نکلا۔ مگر پہلی ہی آواز پر اس کو ایک ہچکی آئی۔ آنکھیں، ماں کی صورت
پر، اور زبان باپ کی یاد میں تھی کہ نسیمہ کی گود میں اس کا لال ہمیشہ کی نیند سو گیا۔''

(اردو افسانے کی روایت۔ مرزا حامد بیگ، ص ۲۱۸)

سلطان حیدر جوش کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جوش کا مشہور افسانہ ''طوق آدم'' میں نسوانی کردار کے مختلف خوبصورت رنگ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر (طوق آدم) کا نسوانی کردار ''حمیدہ'' کہیں خوبصورت کم سن، ماڈرن عورت کی تصویر کشی کرتی ہے اور کہیں صرف ایک نو بیاہتا بیوی کی شکل میں نظر آتی ہے اور کہیں بالکل روایتی عورت کے طور پر افسانے میں جان ڈالتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ افسانہ اس بات کی گواہی پیش کرتا ہے۔:

''وہ میرا ہی دل لبھانے کے لئے سہی روز نت نئی صورت ولباس میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اس کی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غضب تھا۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا، اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ دلکش، سب سے زیادہ فریب، نیچر کی انتہائی صنعت، تہذیب اور ترقی کی نقش آخریں وغیرہ وغیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ

خودستائی اس میں بھڑک اٹھتا اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں ا
ن کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا کالج کا
نام سیماب تھا۔ اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے
خوبصورت سننا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ
ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں، اور میں
کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطب شمالی، قطب جنوبی سے ہے۔ وہ کسی
اور کے حسن کی تعریف سننا نہیں چاہتی تھی، اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی
تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں بادصرصر کا طوفان کہے جا سکتے
ہیں۔ اکثر واقع ہوتے تھے، لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اوپر ہی اتر جایا کرتی تھیں۔
اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز عین اس وقت جبکہ وہ اپنے ٹامکیٹ سے یا بالفاظ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ
ہو چکی تھی، اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبی اور حسن بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی
تھی۔ میں ایک تصویر، انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹریس کی تصویر میری آنکھوں کے
سامنے تھی۔ غالباً وہی خودنمائی اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آ کر دیکھا تو مجھے
ایک دوسری صورت کے نظارے میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلہ خودنمائی زیادہ مشتعل
ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی
کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی اور میں نے آخر کار کہا۔

''پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹریس کس قدر خوبصورت ہے!''

''کیا خاک خوبصورت ہے، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا۔

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ

کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لئے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کئے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادمہ کی ضد تھی کہ پہلے برتن دیکھ لئے جائیں، وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کوئی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب و کتاب ناممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سب سے برابر پیش آتی ہوگی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہئے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قلابہ کے اسٹیشن پر اتری تھی۔ بفرض محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہرگز پہنچنا میرے دل و دماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جا کر خوشامد کرتا یا دو ایک کو درمیان میں ڈال کر اور زیادہ تشہیر کرنا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزانہ اخبار میں کیا۔ اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے، میری حالت سے آگاہ ہو، جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہوگا۔ اور اگر اس نے مان لیجئے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گذر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی"

(اردو افسانے کی روایت۔ مرزا حامد بیگ، ص ۳۰۳۔۲۹۷)

حامد اللہ افسر کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۲۷ء میں

زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوکر منظر عام پر آیا اور قارئین کے بیچ خوب سراہا گیا۔ اس مجموعہ میں کل گیارہ افسانے ہیں۔ ان میں ''ڈالی کا جوگ''، ''گومتی کا فقیر''، ''حیات بعد الموت''، ''مصرانی''، ''سوتیلی ماں'' اور ''بہن کی محبت'' 1924 میں ''صلائے عام'' میں شائع ہوئے۔ حامد اللہ افسر کے افسانے اصلاحی اور اخلاقی نقطہ نظر سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی وسیع النظری اور باریک بینی کے سہارے زندگی کے نئے نئے واقعات سے دلچسپ اور سبق آموز موضوعات نکال لیتے ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی آئینہ داری کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ'' دوسری شادی'' میں ایک ایسے مسلم گھرانے کی روایت کو پیش کیا ہے۔ جس میں نسل پرستی کا بول بالا ہے۔ ہم مذہب اور ہم رتبہ و مرتبہ ہونے کے باوجود غیر خاندان میں شادی کا دستور نہیں ہے۔ اس خاندان میں عورت کی مرضی یا پسند ناپسند کا کوئی دخل نہیں ہے اور صرف روایت کی پاسداری لازمی شرط ہے۔ اس کا فرض محض احکامات کو بجالانے کا ہے، قناعت کرنے کا ہے اور یہ سوچ کر رہ جانے کا ہے کہ:

''میں دن بیاہی بیوہ تھی، اور اس خاندان کی بیوہ تھی جس میں عورت صرف ایک بار بیوی بن سکتی ہے اور ایک ہی بار بیوہ۔''

(دوسری شادی، ادبی دنیا، نوروز نمبر، ۱۹۳۲ء، ص۔ ۷۸)

مجموعی اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں کی روشنی میں علی گڑھ تحریک نے سماجی، سیاسی، تعلیمی انقلاب کے ساتھ نسوانی کرداروں کے ساتھ بھی حتی المقدور انصاف کا برتاؤ کیا ہے۔ انصاف اس معنی میں کہ اس تحریک نے جہاں زندگی کے ہر میدان میں اصلاحی کارکردگی انجام دی وہیں اس سماج کا ایک اداس چہرہ نسوانی کردار بھی اس کے سامنے رہا ہے۔ اس تحریک نے نسوانی کرداروں کو گھر کی چہار دیواری سے نکال کر کالج اور یونیورسٹی تک پہنچایا اور ''العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ'' کو عملی طور پر معاشرے میں نافذ کر دکھایا ہے۔